POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 17-18 January 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

ہفت روزہ
ہماری زبان

HAMARI ZABAN
(Weekly)

اشاعت کا 87واں سال

Date of Publication: 16-01-2026 • Price: 5/- • 22-28 January 2026 • Issue: 4 • Vol:85

۲۲ تا ۲۸ جنوری ۲۰۲۶ء • شمارہ: ۴ • جلد: ۸۵

سرسیّد احمد خاں کے ماموں | مختار الدولہ ناظر وحید الدین احمد خاں

مشتاق احمد تجاروی

ناظر وحید الدین احمد خاں سرسیّد احمد خاں کے بڑے ماموں اور دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد خاں کے بیٹے تھے۔ وہ اپنے دور کی معروف ہستیوں میں شامل تھے۔ دنیوی وجاہت اور شان و شوکت میں وہ اپنے زمانے کے صفِ اول کے لوگوں میں تھے۔ مرزا غالب سے بھی ان کے روابط تھے، ان کی وفات پر مرزا غالب نے ایک قطعۂ تاریخ بھی کہا تھا۔

ناظر وحید الدین احمد خاں کا پورا نام نواب مختار الدولہ وحید الدین احمد خاں بہادر تھا، ان کے والد نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ تھے۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے وزیر رہ چکے تھے، ان کا شمار مغلیہ عہد کے دورِ آخر کی بڑی شخصیات میں ہوتا تھا۔ وہ سرسیّد احمد خاں کے نانا بھی تھے اور مربی بھی وہی تھے۔ ان کے بارے میں سرسیّد احمد خاں نے ایک مستقل کتاب 'سیرتِ فریدیہ' لکھی ہے۔

ناظر وحید الدین احمد خاں نے تعلیم و تربیت سے فارغ ہونے کے بعد غالباً اپنی پہلی ملازمت جنرل آکٹر لونی کے یہاں کی تھی۔ مولوی عبدالقادر رام پوری نے اپنی مشہور کتاب 'علم و عمل' میں لکھا ہے:

> 'وحید الدین پسر فرید الدین دبیر الدولہ ایک مدت تک جنرل آکٹر لونی صاحب کا مصاحب خاص رہا، ملکہ عالم جناب عصمت مآب نواب رحیم النساء بیگم کی مہربانی پر بسر کرتا تھا۔'[1]

خواجہ وحید الدین کو زیادہ عروج اُس وقت ملا جب وہ مغل شہزادے مرزا جہانگیر کی میت کو الٰہ آباد سے لے کر دہلی آئے تھے۔ مرزا جہانگیر اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے اور ممکنہ ولی عہد بھی تھے۔ خواجہ فرید الدین کی وزارت کے زمانے میں مغل دربار کے لیے ایک بڑا حادثہ مرزا جہانگیر سے متعلق تھا۔ مرزا جہانگیر پر ایک انگریز کو قتل کرنے کی کوشش کا الزام لگا اور ان کی گرفتاری ہوگئی، الٰہ آباد میں ان پر مقدمہ چلا۔ اگرچہ اس مقدمے میں ان کو کوئی سزا نہیں ہوئی، لیکن اس مقدمہ بازی کے درمیان الہ آباد میں ہی مرزا جہانگیر کی وفات ہوگئی۔ مرزا جہانگیر کی وفات کے بعد ان کی میت کو ناظر وحید الدین احمد خاں دہلی لے کر آئے تھے۔ مرزا جہانگیر اپنے عہد میں قلعہ کی سب سے ممتاز شخصیت تھے اور اس کا امکان تھا کہ اگر وہ زندہ رہتے تو وہی بادشاہ بھی بنتے۔ ان کی میت کو لے کر آنے کی وجہ سے مرزا جہانگیر کی والدہ نواب ممتاز محل خواجہ وحید الدین خاں پر بہت مہربان ہوگئیں، ان کو اپنے بیٹے کی جگہ سمجھنے لگیں اور مرزا جہانگیر کے بیٹے مرزا تیمور شاہ کی سرکار میں ان کو مختارِ کل بنا کر مختار الدولہ کا خطاب عطا کیا۔ 'سیرتِ فریدیہ' میں اس کا تذکرہ موجود ہے، لکھا ہے:

> 'اس وجہ سے نواب ممتاز محل وحید الدین احمد خاں پر حد سے زیادہ مہربانی ہوگئیں اور کہا کرتی تھیں کہ وحید الدین خاں کو مرزا جہانگیر کے برابر رکھتی ہوں اور مرزا تیمور شاہ جو ایک صغرسن بیٹے مرزا جہانگیر کے تھے اُن کی گود میں دیا اور مرزا تیمور شاہ کی سرکار بجائے مرزا جہانگیر کی سرکار کے نہایت شان و شوکت سے قائم ہوئی اور وحید الدین خاں اُس کے مختارِ کل مقرر ہوئے اور مختار الدولہ کا ان کو خطاب ہوا۔ یہ واقعہ 1238 ہجری مطابق 1822 کا ہے۔'[2]

'سیرتِ فریدیہ' اور 'حیاتِ جاوید' دونوں میں مرزا تیمور کو مرزا جہانگیر کا بیٹا لکھا ہے، لیکن علم و عمل کے محشی معروف محقق ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے کہ مرزا تیمور نواب ممتاز محل کے چھوٹے بیٹے تھے، یعنی مرزا جہانگیر کے بھائی تھے۔[3] چوں کہ دونوں بنیادی مراجع یعنی 'حیاتِ جاوید' اور 'سیرتِ فریدیہ' میں واضح طور پر مرزا تیمور کو مرزا جہاں گیر کا بیٹا لکھا ہے، بھائی نہیں، اس لیے مستند بات یہی ہے۔ غالباً ڈاکٹر محمد ایوب قادری کو کوئی تسامح ہوگیا جو انھوں نے مرزا تیمور کو نواب ممتاز محل کا چھوٹا بیٹا لکھ دیا۔

مغلیہ حکومت کے لیے یہ زوال کا دور تھا۔ حکومت کے حالات میں استقلال نہیں تھا، غالباً اسی وجہ سے کچھ عرصے کے بعد ناظر وحید الدین نے مرزا تیمور کی مختاری سے استعفا دے دیا، 'سیرتِ فریدیہ' میں اس کا بھی تذکرہ ہے۔ استعفا دینے کے بعد انھوں نے کوئی دوسری ملازمت اختیار کرلی، تاہم نواب ممتاز محل بیگم اس کے بعد بھی ان کو اپنے بیٹے کی طرح مانتی رہیں اور ہمیشہ ان پر مہربان رہیں اور ان کے یہاں ان کے مراتب میں کوئی فرق نہیں آیا۔

نواب ممتاز محل کی وفات سے برس ڈیڑھ برس پہلے وہ کسی بات پر خفا ہوکر لکھنؤ چلے گئے تھے، وہاں نواب علی قلی خاں کی سرکار میں باعزت عہدوں پر فائز رہے، لیکن وہاں سے بھی جلد واپس آگئے اور دہلی میں ہی بود و باش اختیار کرلی۔ دہلی میں ان کا مکان کوچہ چیلان میں تھا۔

مختار الدولہ ناظر وحید الدین خاں مغل دربار کے مستقل حاضر باشوں میں تھے، کہیں کہیں ان کے بارے میں کچھ تذکرہ مل جاتا ہے، جیسے بہادر ظفر کے روزنامچے میں لکھا ہے کہ ان کو 19 مارچ 1847 کو خلعت پنچ پارچہ اور رقم جواہر عطا ہوا۔[4]

ناظر وحید الدین احمد خاں کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں مل سکیں، لیکن یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معاشیات کے ماہر تھے۔ نواب ممتاز محل نے بھی ان کو جاگیر کا نگراں بنایا تھا۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے 'علم و عمل' کے حاشیے میں لکھا ہے کہ 1857 میں بہادر شاہ کی سرکار میں بعض معاملات خصوصاً مالی پالیسی کے سلسلے میں بھی ان کی طلبی ہوئی تھی۔[5]

ناظر وحید الدین خاں مغل دربار کے حاضرین اور مشیرین میں سے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ میرٹھ کی فوج جب 1857 میں دہلی پہنچی تو اس وقت خواجہ وحید الدین نے بہادر شاہ کو مشورہ دیا کہ یہ فوج اپنے سردار کا قتل کر کے آئی، اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، آپ مغل شہزادوں میں سے کسی کو فوج کا سردار بنادیں تو ان کی عظمت کی وجہ سے فوج کا اعتماد بحال ہوجائے گا۔ حکیم احسن اللہ خاں کے روزنامچے کی عبارت ہے:

> 'شام کو خواجہ وحید الدین خاں آئے اور بادشاہ کی توجہ اس جانب دلائی کہ شہزادوں کی تقرری فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے کر دی جائے۔ مزید کہا کہ جیسے ہی آپ شہزادوں کو خلعتیں عطا کریں گے، فوج اپنا اعتماد جلد ہی بحال کرلے گی۔ بصورتِ دیگر وہ فوجی جو اپنے افسران کے قاتل ہیں، آپ سے بدتمیزی کریں گے۔'[6]

حکیم احسن اللہ خاں کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر ان کے مشورے قبول کرتے تھے۔ تاہم یہاں ایک دل چسپ بات اور بھی ہے وہ یہ کہ 'مغل شہزادے بہادر شاہ پر پہلے سے زور دے رہے تھے کہ ان کو فوج میں عہدے دیے جائیں، لیکن بہادر شاہ ظفر کہتے تھے کہ تم

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

لوگوں کو جس کام کا تجربہ نہیں وہ کیسے تمھارے حوالے کردوں۔ ناظر وحید الدین احمد خاں کی سفارش کے بعد بادشاہ نے وہی کام کیا جو پہلے نہیں کر رہے تھے۔ اس کی وجوہات ونتائج کو جاننے کے لیے بہت زیادہ غور وفکر کی ضرورت نہیں ہے۔'

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناظر وحید الدین خاں کا شاہی دربار میں کیا مقام تھا اور شاہی دربار میں ان کے مشورے قابلِ قبول تھے۔

ناظر وحید الدین احمد خاں کی وفات کے سلسلے میں 'حیاتِ جاوید' میں لکھا ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہوئے کسی سپاہی کی گولی سے مارے گئے۔[7] نماز وہ اپنے گھر میں پڑھ رہے تھے، بلکہ یہ بھی وضاحت ملتی ہے کہ وہ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے اور اسی حالت میں شہید ہوئے، نماز کی حالت میں شہید ہونے کی وجہ سے وزیر الحسن عابدی کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ نماز مسجد کے اندر ادا کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے اس عبارت میں از خود مسجد کا اضافہ کردیا اور لکھا کہ وہ 'فتح دہلی کے بعد ایک موقعے پر مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے کسی سپاہی کی گولی سے مارے گئے تھے'۔[8] اصل مرجع یعنی 'حیاتِ جاوید' کی عبارت میں لفظ مسجد نہیں ہے، جب کہ حوالہ اسی کا ہے۔ ایک اور دوسری اہم کتاب 'سیرتِ فریدیہ' میں واضح طور پر گھر میں نماز پڑھنے کا تذکرہ ہے۔ 'سیرتِ فریدیہ' میں بھی یہی لکھا ہے:

'جب غدر 1857 میں دہلی فتح ہوئی تو چیلوں کے کوچے میں بعض لوگوں نے فوج انگریزی سے کچھ فساد کیا۔ سپاہی مکان میں گھس پڑے اور نواب مختار الدولہ (ناظر وحید الدین خاں) کے مکان میں بھی جس کا ایک دروازہ چیلوں کے کوچے کی طرف تھا، گھس آئے۔ اُس وقت نواب وحید الدین خاں جو ضعیف ہوگئے تھے نمازِ عصر پڑھ رہے تھے، کسی سپاہی نے عین نماز کی حالت میں ان کے گولی ماری اور ان کا انتقال ہوگیا'۔[9]

ناظر وحید الدین احمد خاں کی وفات پر مرزا غالبؔ نے ایک قطعۂ تاریخِ وفات لکھا تھا جو حسب ذیل ہے:

کرد چوں ناظر وحید الدین زدنیا انتقال
گفتم آیا بر کدام آئیں بود سال وفات
گفت غالب کز سرزاری اگر نامش برند
خود ہمیں ناظر وحید الدین بود سال وفات

وزیر الحسن عابدی نے مادۂ تاریخ کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ ناظر وحید الدین کے اعداد 1275 ہوتے ہیں، ان میں 'ز' کے عدد نکال دیے جائیں تو 1268 حاصل ہوتا ہے جو 1857 کے مطابق ہے۔ 'ز' کے عدد منہا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تیسرے مصرعے میں لکھا ہے کہ زاری کے سر کو ان کے نام میں سے منہا کردو۔ اس طرح ان کی تاریخِ شہادت برآمد ہوجاتی ہے۔

ناظر وحید الدین کا نام آج بالعموم علمی، ادبی اور تہذیبی منظر نامے سے غائب ہے، لیکن ایک دور میں یہ نام دہلی کی تہذیبی وثقافتی زندگی کا لازمی حصہ ہوا کرتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں مغل دربار جن لوگوں سے تشکیل پاتا تھا، ان میں سے ایک اہم شخصیت ناظر وحید الدین خاں کی بھی تھی۔ عہدِ غالبؔ کو صحیح طرح سے سمجھنے کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ ایسے نام جو اس عہد کی تہذیبی وثقافتی زندگی سے وابستہ ہیں۔ ان کی بازیافت کی جائے اور تمام ممکنہ ذرائع معلومات کی روشنی میں ان کی زندگی اور ان کی خدمات کا ایک جامع مرقع تیار کیا جائے، اس طرح اس پورے منظر نامے کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھا جاسکتا ہے۔

حواشی:

۱. رام پوری، عبدالقادر خاں: علم وعمل، اردو ترجمہ معین الدین افضل گڑھی، پروفیسر محمد ایوب قادری، کراچی، طبعِ دوم 1970، ص:295
۲. سر سیّد احمد خاں: سیرتِ فریدیہ، مرتبہ محمود احمد برکاتی، کراچی، 1964، ص:128
۳. علم وعمل، ص:295
۴. حسن نظامی، خواجہ: بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ، دہلی، 1935، ص:129
۵. علم وعمل، ص:295
۶. احسن اللہ خاں حکیم: حکیم احسن اللہ خاں یادداشتیں، اردو ترجمہ جاوید احمد رشید، مشمولہ، 1857 روزنامچے، معاصر تحریریں، روزنامچے، مرتبہ محمد اکرام چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2007، ص:191
۷. حالی، الطاف حسین: حیاتِ جاوید، انجمن ترقی اردو، 1939، ص:23
۸. غالب: باغ دودر، مرتبہ وزیر الحسن عابدی، لاہور، 1969، ص:186
۹. سیرتِ فریدیہ، ص:129

ایسوسی ایٹ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

بھوپال میں برکت اللہ پر تحقیقی کام

عارف عزیز

عظیم محبِّ وطن اور جہاں بین وجہاں گشت انقلابی مولانا برکت اللہ بھوپالی پر ایم عرفان کی تحریر سوانح جو عفان پبلی کیشن بھوپال نے 1969 میں شائع کی۔ ایک ایسے انقلابی کی داستانِ حیات ہے جو سرفروشوں اور جاں بازوں کی نسل کے ایک مثالی نمائندے تھے، انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں برِّصغیر کے عوام کو آزادی کے لیے جدوجہد کا حوصلہ بخشا، وہ ہندستانی انقلاب کے اولین معماروں میں سے ایک تھے اور انقلاب پسند طبقۂ علما کی اس سنہری زنجیر کی ایک کڑی تھے جو حضرت شاہ ولی اللہ، سیّد احمد شہید، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی جیسی عہد آفریں شخصیتوں کے کارناموں سے مربوط ہے۔

مولانا برکت اللہ نے بھوپال کے ایک نچلے متوسط خاندان میں آنکھ کھولی، روایتی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنے باغیانہ ذہن اور انقلابی فطرت کی وجہ سے انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے بھوپال سے جبل پور، پھر بمبئی اور وہاں سے انگلستان پہنچے جہاں اپنی ذہنی صلاحیت اور انقلابی کاموں سے طبعی مناسبت کی بدولت جلد ہی مولانا کا شمار ان افراد میں ہونے لگا جو جدوجہدِ آزادی کو آگے بڑھانے میں مصروف تھے۔ اپنے قیامِ انگلستان اور جاپان کے دوران ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور قوتِ کارکردگی کے جوہر ہی نہ کھلے بلکہ ایک شعلہ بیان مقرر اور مشاق صحافی کی حیثیت سے بھی ان کی شناخت قائم ہوئی۔ بعد میں 'غدر پارٹی' کی تشکیل سے لے کر افغانستان میں جلاوطن حکومت کے قیام تک وہ اپنی باغیانہ سرگرمیوں سے انگریزوں کا ناطقہ بند کرتے رہے۔ اسی طرح روس کے مردِ آہن لینن کو اپنی تحریک کا ہمنوا بنانا یا ہندستان کے ہندو اور مسلم انقلابیوں کو ایک دوسرے سے قریب لانا ان کے اہم کارنامے ہیں جس کے نتیجے میں ہندستانی جیالوں کی جو صفیں 1888 سے 1915 تک مسلم انقلابیوں کی صورت میں دارالعلوم دیوبند کے تحت اور ہندو وطن پرستوں کی شکل میں مہاراشٹر اور بنگال میں علاحدہ علاحدہ نظر آتی ہیں، مل جل کر کام کرنے لگیں۔

اس تمام جدوجہد کا واحد مقصد یہی تھا کہ بیرونی فوجی امداد اور داخلی بغاوت سے ہندستان میں انگریزوں کے استبداد کا خاتمہ ہو بعض اسباب کی بنا پر یہ تحریک اس وقت کامیاب نہ ہوسکی لیکن نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے اس قدر ہمہ گیر تھی کہ ہندستان کی سیاسی جدوجہد کی کوئی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ برکت اللہ بھوپالی نے اس تحریک کو ساری دنیا میں متعارف کرانے اور اس کی حمایت حاصل کرنے میں اپنی زندگی کے قیمتی چالیس برس صرف کردیے اور سیکولر نظام حکومت کا تصور اس وقت پیش کیا جب یہ ہندستانی عوام کے لیے اجنبی تھا۔ یہاں تک کہ تیس برس بعد جب آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت تشکیل پائی تو اُن نظریات پر ہی اس کی بنیاد رکھی گئی جو جلاوطن حکومت کی صورت میں اولاً برکت اللہ بھوپالی نے پیش کیے تھے۔

اس عظیم انقلابی کی زندگی کے احوال وکوائف سے دنیا تو کیا اہلِ وطن بھوپال کے لوگ بھی بے خبر تھے، جستہ جستہ کچھ واقعات بعض اخبارات ورسائل میں شائع ضرور ہوئے یا معدودے چند ایسے افراد تھے جن کی آنکھوں نے ان کو دیکھا اور ان کے بارے میں کچھ جانتے تھے، اس طرح کے تمام شواہد بھی وقت کے ساتھ تیزی سے معدوم ہورہے تھے۔ سب سے پہلے آزاد ہندستان کے پہلے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کو اس کی فکر لاحق ہوئی تو انھوں نے مولانا برکت اللہ کی سوانح حیات قلم بند کرنے کے لیے اس دور کے عوامی نمائندے چتر نرائن مالویہ، سعید اللہ خاں رزمی اور مولانا طرزی مشرقی کو متوجہ کیا اور شاکر علی خاں کے ایما پر یہ کام اردو کے پرانے خدمت گار اور صحافی ایم عرفان کے سپرد کیا گیا جو تاریخ سے بھی شغف رکھتے تھے اور نہایت عرق ریزی کے ساتھ وہ اس سوانح کا مواد جمع کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ایم عرفان نے ایسے تمام ممالک کے سفارت خانوں سے جہاں مولانا نے قیام کیا اور ہندستان کے ان سفارتی نمائندوں سے جو ان ممالک میں موجود تھے، مسلسل خط وکتابت کی، پھر بھی جو مواد ان کے لیے سب سے زیادہ مفید وکارآمد ثابت ہوا اس کے بارے میں وہ خود رقم طراز ہیں:

''مولانا برکت اللہ بھوپالی کی سوانح حیات مرتب کرنے کا مرحلہ آیا تو ان سے متعلق چھوٹے چھوٹے مضامین اکثر و بیشتر اخبارات میں شائع ہوتے رہے، غدر پارٹی یا ہندستان کی تحریکِ آزادی اور انقلابی سرگرمیوں کے سلسلے

میں کوئی مضمون ایسا نہیں تھا جس میں برکت اللہ بھوپالی کا کم وبیش ذکر نہ ہو لیکن تفصیلی مضامین کا فقدان تھا، جہاں چند مضامین جو مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے ہفت روزہ 'سچ' لکھنؤ میں، منشی شاکر حسین نکہت سہسوانی نے 'مدینہ' بجنور میں، سردار گوپال سنگھ نے 'انقلاب' لاہور میں اور ڈاکٹر پی ایس منگل مورتی نے 'دشوانی' الہ آباد میں لکھے وہ بڑی حد تک صحت وحقیقت سے تعلق رکھتے تھے۔

ان کے علاوہ سیڈیشن کمیٹی 1918 کی رپورٹ مرتبہ رولٹ کمیٹی، مہاراجہ مہندر پرتاپ کی 'میری پچپن سالہ داستانِ حیات'، ظفر حسن کی 'آپ بیتی'، رتن لال بنسل فیروزآبادی کی 'مسلم دیش بھگت' نہایت مستند ماخذ ہیں''۔

علاوہ ازیں ایم عرفان کو مولانا برکت اللہ کا ایک مکتوب ڈاکٹر حنیف نقوی سے ملا جو ان کے نانا منشی شاکر حسین نکہت سہسوانی کے نام تھا اور دوسرا خط علامہ ابونصر سید احمد بھوپالی کو لکھا گیا تھا، ان مکتوبات سے عرفان صاحب کو مولانا برکت اللہ کے ان چار برس کے بارے میں تفصیلات فراہم ہوئیں جو جبل پور سے انگلینڈ پہنچنے کے درمیان انھوں نے بمبئ میں گزارے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یوروپ، امریکہ، جاپان اور روس کے بڑے بڑے شہروں کی خاک چھاننے والے اس مردِ مجاہد کا دل اپنے وطن کی یاد اور یہاں کی تنگ گلیوں نیز سیدھے سادے لوگوں کی محبت میں تڑپتا رہتا تھا۔

ابونصر سید احمد بھوپالی جو جامعہ ازہر میں پروفیسر تھے خود بھی مولانا برکت اللہ پر کام کرنا چاہتے تھے لہٰذا اُن کے مکتوب سے عرفان صاحب کو مولانا کی جائے پیدائش کے تعین میں مدد ملی۔ مختلف ذرائع سے انھیں بعض نادر تصاویر بھی ملیں جن کو کتاب کی زینت بنایا گیا۔ اس طرح مولانا برکت اللہ کے بارے میں جو مواد عرفان صاحب کو میسر آیا، اسے انھوں نے 288 صفحات پر پھیلا کر 12 ابواب میں تقسیم کر دیا اور کمالِ خوبی کے ساتھ معروضی نقطۂ نظر سے واقعات وحقائق کو سمجھنے اور ان کے بے لاگ تجزیے کی کوشش کی۔ عرفان صاحب نے اس کتاب میں نہ صرف مولانا برکت اللہ بھوپالی کی داستانِ حیات کو رقم کیا بلکہ ایک مورخ کی طرح اس کے اسباب ومحرکات پر روشنی ڈالی اور حوالوں کی مدد سے حاصل شدہ نتائج پر بحث کی۔

کتاب کا مقدمہ جو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے مشورے پر عرفان صاحب نے خود تحریر کیا، نہایت مفید معلومات اور جائزے پر مشتمل ہے۔ اس میں مولف نے مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کے برسرِ اقتدار آنے کے محرکات پر بھی بحث کی۔ مقدمہ کے حصہ دوم سے جو ہندستان کی جنگِ آزادی میں بھوپال کے حصے پر مشتمل ہے، ہمیں سب سے پہلے عرفان صاحب ہی اس بغاوت سے متعارف کراتے ہیں جو 1857 سے قبل منگل پانڈے کی قیادت میں یہاں برپا ہوئی اور قصبہ سیہور میں ولی شاہ اور ان کے ساتھیوں کو ہندستان کی پہلی متوازی حکومت 'سپاہی بہادر' نام سے قائم کرنے کی پاداش میں انگریزوں نے گولیوں کا نشانہ بنا دیا تھا، گو پورے ملک کی طرح آزادی کے لیے جلائی گئی یہ آگ شعلہ نہ بن سکی لیکن ایم عرفان کی قلمی کاوش سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ریاست بھوپال کے جیالے عوام بھی مادرِ وطن کی آزادی کے لیے کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

برکت اللہ بھوپالی کی اس سوانح کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ بعض منفی پہلو بھی ہیں، ایم عرفان نے بغیر کسی حوالے کے مولانا برکت اللہ کا سنہِ پیدائش 1859 تحریر کیا ہے جب کہ اس سے قبل ملا رموزی نے 'مشاہیرِ بھوپال' میں 1854 اور بعد میں قاضی وجدی الحسینی نے اپنی کتاب 'مولانا برکت اللہ بھوپالی' میں 1862 قرار دیا ہے۔ ان میں صحیح کیا ہے عرفان صاحب کی تحقیق سے اس پر روشنی نہیں پڑتی۔ مولانا کے اول بیرونِ ملک سفرِ انگلستان کے بارے میں بھی عرفان صاحب اپنے اس دعوے کی دلیل دینے سے قاصر رہے ہیں کہ وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ایما پر وہاں گئے تھے حالاں کہ ریشمی رومال تحریک کی تفصیلات مظہر ہیں کہ معروف انقلابی شیاما جی کرشن ورما کی ترغیب اور مالی اعانت کے نتیجے میں وہ انگلستان پہنچے تھے، اس کے علاوہ شریفِ مکہ اور ترکی نمائندے کو باہم قریب لانے کے لیے عرفان صاحب نے جن کوششوں کا ذکر کیا ہے، اس کا حوالہ بھی کتاب میں موجود نہیں۔

ایم عرفان کی نظر سے نیشنل آرکائیوز دلی کا ریکارڈ نہیں گزرا، حالاں کہ قیامِ جاپان کی اس میں کافی تفصیلات موجود ہیں۔ خدا بخش لائبریری میں ہفت روزہ 'سچ' ایڈیٹر مولانا عبدالماجد دریابادی کی پوری فائل موجود ہے، اس کے مطالعے سے ان مکتوب کا علم ہوتا ہے جو مولانا دریابادی کو مولانا برکت اللہ وقتاً فوقتاً تحریر کرتے رہے ہیں۔ پریس سے مولانا برکت اللہ کو کس طرح نکالا، اس کی تفصیلات ملتی ہیں۔ مولانا برکت اللہ کی مشہور کتاب 'خلافت' کے بارے میں بھی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ مولانا نے اس کی پچاس جلدیں 'سچ' کے ایڈیٹر کو بھیجی تھیں، 'خلافت' میں مولانا نے نظریۂ خلافت پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے اس کی ضرورت واہمیت پر فی زمانہ دلائل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے تحریر کیا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ کے بعد اسلام میں خلافت کی جگہ ملوکیت در آئی، جس سے اسلام کی حقیقی روح شورائیت کو صدمہ پہنچا لہٰذا اصلاحِ حال کے لیے خلافت کی تجدید ناگزیر ہے۔ مولانا حسرت موہانی کے رسالے 'اردوے معلیٰ' مئی، جون، جولائی 1907 کے دو شماروں میں مولانا برکت اللہ بھوپالی کا ایک مضمون 'ہندو مسلم در ہندوستان' کے زیرِ عنوان شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے انگریزوں کی ہندستان میں لوٹ کھسوٹ کا نقشہ کھینچ کر صنعت وحرفت کی بربادی اور محصول عائد کر کے یہاں کے مال ودولت کو اپنے ملک انگلستان منتقل کرنے کی داستان بیان کی تھی۔ مولانا دریابادی نے مولانا حسرت موہانی کی وفات پر تحریر مضمون میں بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔ ڈاکومنٹس آف دی ہسٹری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی پہلی جلد میں مولانا برکت اللہ بھوپالی کا کئی جگہ ذکر ملتا ہے اور اس پمفلٹ کا حوالہ بھی، جس میں مولانا برکت اللہ نے مسلمانوں کو تلقین کی تھی کہ کمیونزم سے انھیں خوف کھانے کی ضرورت نہیں، یہ بھی اسلام کی ایک شکل ہے۔ اس پمفلٹ کی ایک کاپی نیشنل آرکائیوز کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے دلی آفس میں محفوظ ہے۔ اسی طرح سہسوانی کے 'مدینہ' بجنور میں شائع مضمون کی ایک کاپی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں کافی خستہ حالت میں موجود ہے۔ راجہ مہیندر پرتاپ کی خود نوشت سوانح 'مائی لائف آف ففٹی فائیو' میں مولانا برکت اللہ بھوپالی کے افغانستان پہنچنے اور مولانا سے ان کی ملاقات نیز حکومت کے قیام اور مولانا کی زندگی کے آخری ایام کا زیادہ تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔

مذکورہ حقائق کی تفصیلات کے بجائے صرف حوالے ایم عرفان کی کتاب میں ملتے ہیں، تاہم بحیثیت مجموعی انھوں نے اپنی کتاب میں دشتِ تحقیق کی سیاحی سے اپنی فطری مناسبت کا ثبوت دے کر سارے مواد کو جو انھیں میسر آیا سلیقے سے تحریر کر دیا ہے، اسی لیے بعد کے لکھنے والوں کے لیے وہ سند کا درجہ رکھتا ہے۔ ایم عرفان کی اس سوانح کے بعد اگرچہ مولانا برکت اللہ پر اور بھی کتابیں منظرِ عام پر آئیں لیکن سبھی مذکورہ کتاب کا پرتو نظر آتی ہیں۔ علامہ قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی مرحوم کی کتاب 'مولانا برکت اللہ بھوپالی' میں اگرچہ مولانا کی فکر ونظر کے تعلق سے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں لیکن ڈاکٹر گومتی شن کشل کی ہندی میں کتاب 'کرانتی دوت' جسے 1988 میں کرشنا ہوم پرنٹنگ، بھوپال نے طبع کرایا اور ڈاکٹر گومتی کو برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ اس کتاب کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔ ایم عرفان کی 'برکت اللہ بھوپالی' کو سامنے رکھ کر اس کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا، یہاں تک کہ کتاب کی تصاویر بھی ہو بہو نقل کی گئی ہیں۔ اس طرح ہندی داں حلقے کو مولانا برکت اللہ بھوپالی کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے متعارف ہونے کا وسیلہ ضرور حاصل ہو گیا لیکن مولانا کے بارے میں کوئی نئی تحقیق سامنے نہیں آتی۔ حیدرآباد کے محمد یوسف رحمت اللہ کی کتاب 'مولانا برکت اللہ بھوپالی' کو ٹیپو سلطان ریسرچ سنٹر حیدرآباد نے 1999 میں شائع کیا ہے۔ 31 صفحات کے اس کتابچے کو ایم عرفان اور قاضی وجدی الحسینی کی کتب نیز مولانا محمد میاں کی 'ریشمی رومال تحریک' کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے۔ ایم عرفان کی کتاب کا ایک اور ترجمہ 2003 کے دوران انگریزی زبان میں ڈاکٹر افتخار علی کے قلم سے باب العلم پبلی کیشنز بھوپال نے شائع کیا ہے لیکن مترجم نے ایم عرفان کی کتاب کے اس حصے کو حذف کر دیا ہے جس میں خاتمۂ خلافت اور ترکی کی عثمانی سلطنت کے زوال کا واقعہ بیان کیا گیا یا دوسرے ان واقعات کو جن کی کتاب میں تکرار ہوئی، شامل نہیں کیا ہے۔ 'نقیبِ انقلاب، مولانا برکت اللہ بھوپالی'، شفقت رضوی کی 2004 میں خدا بخش پبلک لائبریری پٹنہ سے منظرِ عام پر آنے والی کتاب ہے، اس میں بھی ایم عرفان کی کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی کی تاریخ پیدائش پر غیر ضروری اور طویل بحث ہے، حالاں کہ مؤلف کو صرف اپنی رائے کا اظہار کر دینا چاہیے تھا۔ کتاب میں یہ بھی تحریر ہے کہ برکت اللہ بھوپالی کے والد کا ان کے قیامِ بھوپال کے دوران انتقال ہو گیا تھا، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ برکت اللہ کے بھوپال سے جانے کے بعد ان کے والد کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے مکان کے باہر پلنگ بچھا کر بیٹھ جاتے تھے تاکہ برکت اللہ لوٹیں تو انھیں دیکھ کر اپنے مکان کو پہچان لیں، شفقت رضوی کی کتاب میں کئی پاکستانی کتب کے حوالے ملتے ہیں، اس کی ایک ہی خصوصیت ہے کہ برکت اللہ کے فارسی مکتوبات کا اردو میں ترجمہ کر کے ان کی تفصیلات کو اردو داں قارئین کے لیے سہل الحصول بنا دیا گیا ہے۔

سعودی عرب کے ایک اسکالر پروفیسر صالح سامرائی نے جو ٹوکیو میں طویل عرصے سے مقیم ہیں مولانا برکت اللہ بھوپالی کے بارے میں تحقیق وجستجو کے بعد وہاں ان کے قیام اور ٹوکیو یونی ورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات نیز ہندستان کی آزادی کے لیے مولانا کی سعیِ مسلسل پر کافی مواد جمع کر لیا ہے۔ موصوف کے پاس مولانا برکت اللہ کے جاپان سے شائع 'اسلامک فرٹینٹی' کے شائع بیس شماروں میں سے دو شمارے بھی ہیں، 1995 میں بھوپال تشریف لائے تو ان شماروں کی فوٹو کاپیاں یہاں کئی اداروں کو دے کر گئے تھے۔

مختلف اہلِ قلم اور محققوں کے مذکورہ کام کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا برکت اللہ بھوپالی کی جدوجہدِ آزادی میں خدمات اور حیات پر نیشنل آرکائیوز کے ریکارڈ کو پیشِ نظر رکھ کر مزید کام کی ضرورت ہے تاکہ اس عظیم محبِّ وطن کے شایانِ شان ایک کتاب اور مرتب ہو سکے۔

20- گھاٹی بھڑ بھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال-462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob. No. 9425673760

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اردو دُنیا

بزرگ مصنّفین، شعرا اور صحافی پنشنرز کو جلد پنشن کی رقم جاری کی جائے گی، دہلی حکومت کی منظوری

نئی دہلی (14 جنوری)۔ بزرگ مصنّفین، شعرا اور صحافیوں کو جلد ہی مالی اعانت کے طور پر پنشن کی رقم جاری کر دی جائے گی۔ ذرائع کے مطابق دو سے چار روز کے اندر یہ رقم پنشنرس کے بینک کھاتوں میں منتقل کر دی جائے گی۔ یہ پنشن گذشتہ سال اپریل سے جاری نہیں کی گئی تھی، جس کے باعث بیشتر پنشنرس شدید پریشانی کا شکار تھے، کیوں کہ ان کی گزر بسر کا بڑا سہارا یہی رقم تھی۔ حکومت سے منظوری ملنے کے بعد انھیں بڑی راحت ملنے کی امید ہے۔

قابلِ ذکر ہے کہ روزنامہ 'انقلاب' نے اس مسئلے کو متعدد مرتبہ اجاگر کیا تھا۔ ذرائع سے موصولہ اطلاع کے مطابق محکمۂ فن، ثقافت و السنہ کے وزیر کپل مشرا نے پنشن سے متعلق فائل پر دستخط کر دیے ہیں، جس کے بعد جلد ہی پنشن کی رقم مستحقین کے بینک کھاتوں میں منتقل کر دی جائے گی۔

واضح رہے کہ ہر سال مارچ کے بعد اردو اکادمی دہلی کو نئے مالی سال کے لیے حکومت کے پاس پنشن اسکیم کا پرپوزل بھیجنا پڑتا ہے۔ حکومت کی منظوری کے بعد ہی اس اسکیم کے تحت ضرورت مندوں کو پنشن کی رقم جاری کی جاتی ہے۔ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے تقریباً 16 پنشنرس کو ہر ماہ دس ہزار روپے کی مالی اعانت دی جاتی ہے، جب کہ کسی پنشنر کے انتقال کی صورت میں اس کے اہلِ خانہ کو پانچ ہزار روپے ماہانہ پنشن دی جاتی ہے۔ دوسری جانب اردو اکادمی دہلی کی گورننگ کونسل کا اب تک کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ گذشتہ سال دہلی میں بی جے پی کی حکومت بننے کے بعد وزیرِ اعلا ریکھا گپتا نے دہلی کی تمام اکادمیوں، کمیٹیوں، بورڈز اور کمیشنوں کو تحلیل کر دیا تھا، جن میں اردو اکادمی دہلی بھی شامل ہے۔ اس کے بعد سے آج تک اکادمی کی گورننگ کونسل کی تشکیلِ نو نہیں ہوسکی ہے۔ ذرائع کے مطابق دہلی حکومت کی جانب سے اردو اکادمی دہلی کی تشکیلِ نو کے سلسلے میں فی الحال کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ 2023 سے دہلی وقف بورڈ اور دہلی اقلیتی کمیشن بھی تحلیل ہیں، جنھیں سابقہ عام آدمی پارٹی کی حکومت نے نظر انداز کیا اور اب بی جے پی حکومت کے دور میں بھی یہ ادارے عملاً غیر فعال ہیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو ڈائرکٹوریٹ کے تحت اردو مسوّدہ اشاعتی انتخاب کمیٹی کی تشکیل

پٹنہ (16 جنوری)۔ مالی سال 26-2025 کے لیے محکمۂ کابینہ سکریٹریٹ، اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعے اردو مسودہ اشاعتی امداد منصوبے کے لیے حکومت نے دو رُکنی اردو مسودہ اشاعتی انتخاب کمیٹی کی تشکیل کر دی ہے۔ اس سلسلے میں اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر بشمول ایڈیشنل سکریٹری، حکومتِ بہار نے ایک پریس ریلیز جاری کرتے ہوئے بہار سے تعلق رکھنے والے اردو ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں سے اپیل کی ہے کہ وہ 10 فروری 2026 کو شام چھے بجے تک اردو ادب کی مختلف اصناف کے معیاری، طبع زاد و غیر مطبوعہ مسودے اردو ڈائرکٹوریٹ کے مجوزہ فارم کے ساتھ (جسے ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے) دفتر واقع فنیشور ناتھ رینو ہندی بھون، نزد آکاش وانی، چھجو باغ، پٹنہ-800001 میں جمع کر دیں۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات محکمے کی ویب سائٹ https:/state.bihar.gov.in/csd سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ (قومی تنظیم۔ پٹنہ)

تین نئی کتابوں کا اجرا

نئی دہلی (18 جنوری)۔ 'بھارت منڈپم' میں منعقد عالمی کتاب میلے میں نامک پبلی کیشن کے اسٹال پر انجینئر فیروز مظفر کی دو کتابوں 'ارمغانِ پرویز' اور 'ہندوستان اِن اردو' اور پرویز مظفر کے شعری مجموعے 'درد میں تیرتے پھول' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ تینوں کتابیں نامک پبلی کیشن نے شائع کی ہیں۔ ان کتابوں کا اجرا 'بیسویں صدی' کی مدیرہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر رخشندہ روحی، ترنم جہاں اور نامک پبلی کیشن کی ڈائرکٹر بھی موجود تھیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

تلنگانہ اردو ورکنگ جرنلسٹس یونین کے اجلاس میں اہم فیصلے

حیدر آباد (12 جنوری)۔ تلنگانہ اردو ورکنگ جرنلسٹس یونین کا اسٹیٹ کونسل اجلاس صدر دفتر واقع شاہ نگر، مصری گنج میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں تنظیم کے استحکام، صحافیوں کی فلاح و بہبود اور پیشۂ صحافت کو درپیش مسائل پر تفصیلی غور وخوض کیا گیا جس میں ریاستی اور ضلع سطح کے صدور و معتمدین، عہدیدار و ارکان صحافیوں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر مختلف اہم امور زیرِ بحث آئے اور کئی کلیدی فیصلے کیے گئے۔ اجلاس میں حکومتِ تلنگانہ سے تنظیم کے صدر ڈاکٹر شجاع الدین افتخاری نے مطالبہ کیا کہ ایسے سینئر صحافی حضرات جن کی عمر 55 برس مکمل ہوچکی ہو، انھیں ماہانہ اعزازیہ فراہم کیا جائے کیوں کہ صحافی عمر بھر سماج کی رہنمائی اور عوامی مسائل کی ترجمانی میں گراں قدر خدمات انجام دیتا ہے، لہٰذا اس کی خدمات کے اعتراف میں حکومتی سطح پر اردو اکادمی کے ذریعے اعزازیہ دیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ مطالبہ کیا گیا کہ اکریڈیٹیشن کارڈ رکھنے والے صحافی کے انتقال پر حکومت کی جانب سے پانچ لاکھ روپے بطورِ ایکس گریشیا فراہم کیے جائیں۔ تنظیم سے وابستہ کسی صحافی کے انتقال کی صورت میں اس کے اہلِ خانہ کو تنظیم کی جانب سے مالی امداد، نیز بیمار صحافیوں کو یونین کی جانب سے حتی المقدور مدد اور ہیلتھ انشورنس کے بارے میں غور کیا گیا۔ اجلاس میں اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ تلنگانہ اردو ورکنگ جرنلسٹس یونین کے سرکاری سطح پر شمولیت اردو میڈیم کے نمائندے کو اکریڈیٹیشن کمیٹی میں شامل کرنے کا مطالبہ حکومت نے قبول کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں جاری کیے گئے جی او میں اردو میڈیم کو شامل کیا جانا تلنگانہ اردو ورکنگ جرنلسٹس یونین کی موثر نمائندگی کا واضح ثبوت ہے، جسے یونین کی ایک بڑی کامیابی قرار دیا گیا۔ اس سے ہر ایک اردو صحافی کو مدد ملے گی جو چاہے کسی بھی یونین، فیڈریشن یا ایسوسی ایشن سے وابستہ ہوگا۔ اس موقعے پر فیصلہ کیا گیا کہ حکومت کی جانب سے جو سرکاری احکام حالیہ عرصے میں جاری کیے گئے ہیں ان میں پائے جانے والے بعض نقائص کے ضمن میں یونین کی جانب سے رسمی نمائندگی کی جائے گی۔ اجلاس کی صدارت یونین کے صدر ڈاکٹر شجاع الدین افتخاری نے کی، جب کہ اجلاس کی کارروائی مفتی محمد رئیس الدین قاسمی (سکریٹری جنرل) نے انجام دی۔ تنظیم کے سرپرستِ اعلا ڈاکٹر ساجد معراج نے یونین کی کارکردگی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ (سیاست۔ حیدر آباد)

انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ میں آن لائن توسیعی میٹنگ کا انعقاد

رانچی (پریس ریلیز)۔ انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ کی ایک آن لائن توسیعی میٹنگ مورخہ 18 جنوری 2026 کو گوگل میٹ کے توسط سے ڈاکٹر یاسین انصاری کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں ریاستی و ضلع سطح کے عہدیداران، اراکین اور خصوصی مدعوئین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

میٹنگ کے آغاز میں مجلس کے ناظم اور انجمن کے ریاستی جنرل سکریٹری ایم زیڈ خان نے انجمن کی حالیہ کارکردگیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ نے عزت مآب وزیرِ اعلا جھارکھنڈ کو ایک اہم احتجاجی مکتوب ارسال کیا ہے، جس میں جھارکھنڈ اکیڈمک کونسل (JAC) کی جانب سے جاری کردہ نوٹیفکیشن نمبر 50 / 2025 پر سخت تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ یہ نوٹیفکیشن عملی طور پر سب سے زیادہ اردو طلبہ و طالبات کو متاثر کرے گا اور اردو تعلیم کے مستقبل کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ اردو سے متعلق دیگر درپیش مسائل کی یکسوئی، اردو کے حوالے سے وزیرِ اعلا کے سابقہ وعدوں کی یاد دہانی اور ان پر عمل آوری کو یقینی بنانے کے لیے عزت مآب وزیرِ اعلا جھارکھنڈ سے براہِ راست ملاقات کی اجازت طلب کرتے ہوئے باقاعدہ تحریری درخواست بھی ارسال کی گئی ہے۔

میٹنگ میں انجمن کی کارکردگی کو مزید موثر اور منظّم بنانے کے لیے ریاست کی مختلف کمشنریوں میں انچارج حضرات کا تقرر عمل میں آیا۔ پلاموکمشنری کے لیے گوہر علی خان (گڑھوا) اور ڈاکٹر انتخاب عالم (ڈالٹن گنج)، کولہان کمشنری کے لیے محمد ضیاء المبین انصاری اور سمیع احمد خان، سنتھال پرگنہ کے لیے ڈاکٹر انظر حسین (گریڈیہ)، رضا مدھوپوری (مدھوپور) اور سلیمان جہانگیر (گڈا)، چھوٹا ناگپور جنوب کے لیے ڈاکٹر جمشید قمر (رانچی)، ڈاکٹر محفوظ عالم (رانچی) اور ڈاکٹر ارشد مومن (لوہر دگا) جب کہ چھوٹا ناگپور شمال کے لیے شاہنواز احمد خان (ہزاری باغ)، ایس.ایم.اے رضوی (دھنباد)، ڈاکٹر اشرف علی (رام گڑھ) اور ڈاکٹر سجاد حسین (کوڈرما) کو انچارج منتخب کیا گیا۔

میٹنگ میں تنظیمی استحکام اور کارکردگی کو مزید موثر بنانے کے لیے دیگر اہم فیصلے بھی کیے گئے، جن میں آر ٹی آئی کے ذریعے سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی منظور شدہ اور خالی اسامیوں کی تفصیل حاصل کرنا، اردو پڑھنے والے طلبہ و طالبات کی تعداد سے متعلق مستند معلومات جمع کرنا، ہر ضلع میں ماہانہ ادبی نشست اور ہر تین ماہ میں تنظیمی اجلاس کا انعقاد، نیز ٹیمیں تشکیل دے کر رکنیت سازی مہم کے آغاز جیسے امور شامل ہیں۔

اس میٹنگ میں رانچی سے جمشید قمر، محفوظ عالم، ریحانہ محمد علی، محمد شکیل احمد، یاسمین لال، ایم زیڈ خان، گڑھوا سے یاسین انصاری، گوہر علی خان، خدا بخش انصاری، ایم این صدیقی، گڈا سے سلیمان جہانگیر، دمکا سے محمد افضل، مدھوپور سے رضا مدھوپوری، جام تاڑا سے محمد رقیب رحمانی، گریڈیہ سے ڈاکٹر انظر حسین، مفتی سعید عالم، ڈاکٹر فرحت جہاں، ڈالٹن گنج سے انتخاب عالم، منور زماں خان، دھنباد سے حسن نظامی، ایس ایم اے رضوی، عبدالرحمان عبد، رام گڑھ سے ڈاکٹر اشرف علی اور جمشید پور سے ضیاء المبین انصاری، محمد یحییٰ اور حسنین خان شریکِ محفل تھے۔

میٹنگ کے اختتام پر صدرِ محفل ڈاکٹر یاسین انصاری نے تمام شرکائے اجلاس کی آرا اور تجاویز کا جامع تجزیہ پیش کرتے ہوئے ان کی فعال شرکت پر شکریہ ادا کیا اور اردو زبان کے فروغ، تحفظ اور اس کے آئینی حقوق کی بازیابی کے لیے انجمن کی جدوجہد کو مزید منظّم اور تیز کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے میٹنگ کے اختتام کا اعلان کیا۔

حیاتی رکن کی وفات پر
انجمن کی غیراہم تقریب پراظہارِافسوس

گلبرگہ (20 جنوری)۔ ڈاکٹر منظور احمد دکنی رکن انجمن ترقی اردو ہند شاخ گلبرگہ نے انجمن کی معزز حیاتی رکن محترمہ بشیر النساء بیگم کے سانحۂ ارتحال پر شدید افسوس کا اظہار کرتے ہوئے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین!

ڈاکٹر منظور احمد دکنی نے حیاتی رکن کی وفات کے بعد انجمن ترقی اردو ہند شاخ گلبرگہ کے غیر آئینی مجلسِ عاملہ کی جانب سے ایک غیراہم تقریب پر شدید افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ واقعہ ہماری مذہبی، تہذیبی اور انسانی اقدار کی پامالی کی بدترین مثال ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرحومہ انجمن کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنے والی عوام کے ہردلعزیز قائد مرحوم سابق وزیر محمد علی کی ہمشیرہ اور اردو و فارسی کی انتہائی مقبول و معروف استانی تھیں جن کی وفات پر اردو تہذیب کا دم بھرنے والوں نے جو رَویّہ اختیار کیا وہ انتہائی شرمناک اور شدید مذمت کا حامل ہے۔ انھوں نے حیاتی رکن کی وفات پر انجمن کی غیراہم تقریب کی برقراری پر شدید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ادبی تاریخ کا انتہائی سیاہ باب قرار دیا اور اس عمل کو اردو ادب کی باوقار اعلا تہذیبی و ادبی اقدار کو اندھے کنویں کی نذر کرنے سے تعبیر کیا۔ انھوں نے انجمن کی حیاتی رکن کی وفات پر منعقد تقریب کی نیوز کے حوالے سے کہا کہ کیا یہی 'گلبرگہ کی ادبی وراثت محفوظ کرنے کی سنجیدہ کوشش' کا شرمناک آغاز ہے۔ انھوں نے 'گلبرگہ کے ادب ساز' سے صدر انجمن کا حقیقی مقام و مرتبہ پامال کرنے اور انجمن کی روایت سے روگردانی کرنے کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ اس شمارے میں مقامی اور انجمن کے قلمکاروں کو محض ذاتی مخاصمت، عداوت اور کینہ و بغض کی بنیاد پر نظرانداز کیے جانے کے بعد گلبرگہ کی ادبی وراثت کی فکر کرنے میں واضح کھوکھلاپن نظر آتا ہے۔

منظور احمد نے مذکورہ نیوز کا ذکر کرتے ہوئے 'انجمن کے سلسلۂ مطبوعات کی چھٹی کتاب'... والے بیان پر متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ جب کاغذ کے اوراق پر لکھی یا چھاپی گئی تحریروں کا ہر مجلد مجموعہ کتاب کہلاتا ہے تو انجمن کے دیگر چودہ مجلّاتِ انجمن جس میں 'مجتبیٰ حسین نمبر' بھی شامل ہے کیا یہ کتابیں نہیں کہلاتے۔ کیا یہ انجمن کے سلسلۂ مطبوعات سے خارج ہیں۔ واضح رہے کہ انجمن کے سارے مجلّات مختلف قلمکاروں کی تخلیقات کے مجموعے ہیں جنھیں مرتب کیا گیا ہے تو غور فرمائیں کہ 'انجمن کے سلسلۂ مطبوعات کی چھٹی کتاب' کا شوشۂ فتنہ پرور کا امتیاز کس بغض کا غماز ہے۔ انھوں نے بعض اخبارات کے حوالے سے کہا کہ نام نہاد معتمد کے انجمن کے اربابِ اختیار سے اظہارِ تشکر' سے مراد کیا وہی لوگ ہیں جنھوں نے سرپرستانِ انجمن، دستورِ انجمن اور احکاماتِ کوآپریٹیو سوسائٹیز سے روگردانی کرتے ہوئے فرضی الیکشن کے انعقاد سے اِنھیں جھوٹا اقتدار بخشا جس سے مستقل قبضے کے ناجائز خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی گمراہ کن راہ ہموار کی گئی ہے۔

یہ بات بھی دعوتِ فکر بخشتی ہے کہ کیا 'خوش سلیقگی' اکادمی اور انجمنوں کے سرمایے سے کتابیں مرتب کر کے ایک اور سرکاری ادارے کی شرائط کی خلاف ورزی کے ساتھ انھیں مستحق قلمکاروں کے حقوق تلف کرتے ہوئے فروخت کرنا ہے۔ انھوں نے سوال کیا کہ کیا حیاتی رکن کی وفات پر انجمن کی کتابوں کی تقریبِ رسمِ اجرا کے انعقاد سے نام نہاد مجلسِ عاملہ نے نئی نسل کو 'ادبی وراثت کی سنجیدہ کوشش' کا یہی درس دے رہی ہے۔ انھوں نے انتہائی سنجیدگی سے بڑی گہری اور موثر تمثیل پیش کرتے ہوئے بتایا کہ کسی بھی ادارے میں دورانِ اجلاس اگر ادارے کے ایک جاروب کش کے انتقال کی بھی اطلاع مل جائے تو فوری طور پر دو منٹ کی خاموشی کے بعد کتنا ہی اہم اجلاس کیوں نہ ہو، ملتوی کر دیے جانے کی اخلاقی و انسانی ذمہ داری کی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں تاہم کسی ادارے کے اہم ترین حیاتی رکن کے انتقال کے بعد اس کی تدفین سے قبل اعلان کردہ غیراہم تقریب کے انعقاد جیسے ظالمانہ رویے کی کہیں کوئی مثال ہرگز ہرگز نہیں مل سکتی، جس کے بعد ایسی کسی بھی نامعقول اور غیر آئینی مجلس کو مزید برقرار رہنے کا کوئی بھی اختیار حاصل نہیں ہے۔ یہ رویّہ سراسر ہمارے مذہبی، تہذیبی اور دستوری اقدار کے مغائر ہے۔

اردو یونیورسٹی کی زمین واپس لینے کا حکومت کا کوئی ارادہ نہیں: اظہرالدین

حیدرآباد (10 جنوری)۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی اراضی سے متعلق جاری قیاس آرائیوں پر تلنگانہ کے وزیر اقلیتی بہبود جناب محمد اظہرالدین نے اہم وضاحت جاری کی ہے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ حکومت کا اردو یونیورسٹی کی اراضی واپس لینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور یونیورسٹی کی اراضی مکمل طور پر محفوظ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اراضی کے سلسلے میں حالیہ تنازع آڈٹ ریمارکس کی بنیاد پر ضلع کلکٹر کی جانب سے جاری کردہ ایک نوٹس کے بعد شروع ہوا تھا۔ انھوں نے واضح کیا کہ اس نوٹس کا مقصد صرف یہ تھا کہ یونیورسٹی اپنی اراضی کا موثر استعمال کرے نہ کہ اراضی چھیننا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ تین دن قبل یونیورسٹی کے رجسٹرار نے کلکٹر سے ملاقات کی اور انھیں اراضی کے سلسلے میں مستقبل کے منصوبوں سے واقف کرایا جس کے بعد کلکٹر نے نوٹس واپس لینے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملے پر کافی بیانات دیے گئے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ حکومت کی نیت بالکل صاف ہے۔ وزیر موصوف نے واضح کیا کہ کلکٹر نے اس سلسلے میں ایک پریس نوٹ بھی جاری کر دیا ہے جس میں صورتِ حال واضح کر دی گئی ہے۔ عوام اور یونیورسٹی انتظامیہ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ (انقلاب۔دہلی)

عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کے زیرِ اہتمام 'میرا تخلیقی سفر' اور 'ڈیجیٹل میڈیا: چیلنجز اور مواقع' کے عنوان سے مذاکرے

نئی دہلی (پریس ریلیز، 15 جنوری)۔ عالمی کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے اسٹال پر دو اہم ادبی موضوعات پر مذاکروں کا انعقاد ہوا، جن میں اہلِ علم و ادب کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ 'میرا تخلیقی سفر: مصنّفین سے ملاقات' میں پروفیسر طارق چھتاری، ڈاکٹر خورشید اکرم اور جناب راجیو پرکاش ساحر بطور پینلسٹ شریک ہوئے، جب کہ مذاکرے کی نظامت کے فرائض جناب مالک اشتر نے انجام دیے۔ پروفیسر طارق چھتاری نے اپنے تخلیقی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کا گھریلو ماحول تعلیمی تھا، گھر میں کتابوں کی موجودگی نے بچپن ہی سے مطالعے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے کہا کہ ابتدا ہی سے ان کا ذہن تخلیقی انداز میں سوچنے کا عادی رہا، مختلف موضوعات پر خیالات آتے رہے اور اسی عمل کے دوران مکالمے ذہن میں تشکیل پاتے گئے۔ انھوں نے اپنی پہلی کہانی کے پس منظر اور اس پر معروف افسانہ نگار سید محمد اشرف کی حوصلہ افزائی کا ذکر بھی بڑے دلچسپ انداز میں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تخلیق ایک مسلسل عمل ہے جو تخلیق کار کے ذہن میں ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ انھوں نے سائنس سے اردو ادب کی طرف اپنے سفر اور رسائل میں تخلیقات کی اشاعت کے تجربات بھی تفصیل سے بیان کیے۔ ڈاکٹر خورشید اکرم نے کہا کہ افسانہ ان کا پہلا عشق رہا ہے۔ ابتدا میں رسائل میں کہانیاں پڑھتے رہے اور پھر تخلیق کی طرف راغب ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ہر تخلیق اپنے الجھاؤ سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے، اگر اسے خوبصورت راستہ مل جائے تو فکشن وجود میں آتا ہے اور اگر سرا نہ ملے تو شاعری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ابتدا میں وہ غزل سے مرعوب تھے، مگر اوزان و بحور کی پابندی نے انھیں نثری نظم کی طرف مائل کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تخلیق اچانک نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے بہتر ماحول، اچھے دوست اور وافر مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ جناب راجیو پرکاش ساحر نے کہا کہ اردو سے محبت ہی نے ان کے اندر کے تخلیق کار کو بیدار کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو انھیں وراثت میں نہیں ملی بلکہ انھوں نے محنت اور لگن کے ساتھ اردو زبان اور اس کا رسمِ خط سیکھا۔ انھوں نے کہا کہ زندگی کے گہرے مشاہدے اور لکھنؤ کے ادبی ماحول نے ان کے تخلیقی سفر میں اہم کردار ادا کیا۔ مذاکرے کے اختتام پر تینوں تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات بھی پیش کیں، جنھیں حاضرین نے بے حد سراہا۔

اس سے قبل 'ڈیجیٹل میڈیا: چیلنجز اور مواقع' کے عنوان سے ایک مذاکرہ منعقد ہوا، جس میں محمد نسیم نقوی، اشرف بستوی، ڈاکٹر خالد رضا خان اور ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے بطور پینلسٹ شرکت کی، جب کہ نظامت ڈاکٹر مسعود احمد نے کی۔ محمد نسیم نقوی نے کہا کہ سوشل میڈیا اسی وقت مفید ثابت ہوسکتا ہے جب اس کا مثبت اور ذمے دارانہ استعمال کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ خبروں کی ترسیل میں تصدیق اور احتیاط بے حد ضروری ہے، ورنہ ڈیجیٹل میڈیا کے نقصانات زیادہ ہو سکتے ہیں۔ اشرف بستوی نے کہا کہ ڈیجیٹل میڈیا نے عام لوگوں کو اظہار کا پلیٹ فارم فراہم کیا ہے، تاہم غلط خبروں سے محتاط رہنے کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے والدین پر زور دیا کہ وہ ڈیجیٹل دور میں بچوں کی صحیح رہنمائی کریں۔ ڈاکٹر خالد رضا خان نے کہا کہ ڈیجیٹل میڈیا نے معلومات تک رسائی کو آسان بنا دیا ہے، مگر اس کے ساتھ توجہ کے انتشار اور وقت کے ضیاع کا خطرہ بھی موجود ہے۔ انھوں نے اردو کتابوں کو ڈیجیٹائز کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے کہا کہ سوشل میڈیا نے عام انسان کی آواز کو دور تک پہنچایا ہے، تاہم بچوں اور نوجوانوں کو اس کے بے جا استعمال اور مصنوعی ذہانت (اے آئی) کے منفی اثرات سے بچانا ضروری ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرورالہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : بیانِ رفتگاں
مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
اشاعت : 2025
ضخامت : 232 صفحات
قیمت : 350 روپے
ناشر : ادبی دائرہ، شائستہ منزل، 641، غلامی کا پورا (عقب آواس وکاس کالونی) ضلع اعظم گڑھ
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر

E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com

اُردو ادب میں وفیاتی ادب کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا باقاعدہ سہرا دار المصنّفین کے سر باندھا جاتا ہے۔یہیں پر 'ناموران اسلام' کتاب کے ذریعے سوانح نگاری کا روشن باب وا ہوا۔اس کے بعد ملک کے مختلف گوشوں سے اس دارِ فانی سے رخصت ہونے والے ناموران ادب و شخصیات کی خدمات کو مضامین کی شکل میں پیش کرنے کا سلسلہ جاری وساری ہے۔یوں تو ہر انسان جس سے وہ محبت کرتا ہے اس کی یاد میں زبانی بہت کچھ کہہ دیتا ہے لیکن اسے تحریری شکل دینا ایک مشکل عمل ہے۔اس دارِفانی سے رخصت ہو چکے فرد کی ایک ایک بات، ملاقات اور ایام سے متعلق گہرے نقوش فاضل مضمون نگار کی تحریروں میں جا بجا موجود رہتے ہیں۔اس دنیا کو خیر باد کہہ چکے اہلِ علم و با کمال شخصیات کے بیان کو ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے بڑے سلیقے اور ہنر مندی سے 'بیانِ رفتگاں' میں پیش کیا ہے۔اس کتاب میں ڈاکٹر موصوف نے اس دنیا سے رخصت ہونے والی قابلِ قدر شخصیات سے اپنے ذاتی، ادبی و علمی تعلقات کو طشت از بام کیا ہے۔اس سے قبل ان کے بعض وفیاتی مضامین 'عظمت کے نشاں'، 'مطالعات و مشاہدات'، 'عکس و اثر'، 'حرف و اثر' اور 'قد اور سایے' میں شامل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں الیاس صاحب نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی 16 سر کردہ شخصیتوں کے سوانحی حالات کے ساتھ علمی وادبی فتوحات کو قلم بند کیا جن سے موصوف کے دیرینہ تعلقات تھے۔ان اہم شخصیات میں پروفیسر خورشید نعمانی، پروفیسر اصغر عباس، مولانا سید جلال الدین عمری، اثر انصاری، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا اسیر ادروی، مولانا نظام الدین اصلاحی، ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، مولانا مستقیم احسن اعظمی، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، راشد علی زئی مرحوم، افضل حق قریشی، ڈاکٹر اسرار احمد فلاحی، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی اور ضیا فاروقی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔علاوہ ازیں انھوں نے ضمیمے کے طور پر ماہنامہ آج کل (نئی دہلی) اور ماہنامہ اُردو دنیا (نئی دہلی) میں شائع شدہ انٹرویوز کو شامل کیا ہے۔

بنیادی طور پر الیاس صاحب کی شناخت شبلی شناسوں میں ہوتی ہے، لیکن انھوں نے زیرِ نظر کتاب میں بار بار رقم کیا ہے کہ وہ کوئی ماہرِ شبلی نہیں ہیں بلکہ شبلی کی تحریروں سے انھیں بہ حیثیت طالبِ علم عشق و محبت ہے۔انھوں نے زیرِ نظر کتاب میں جس اہلِ علم پر بھی قلم اٹھایا اس پر پوری دیانت داری اور ایمان داری کے ساتھ لکھا ہے۔ان کے مرحوم کے ساتھ جیسے تعلقات تھے ویسے ہی قلم بند کیے۔ پروفیسر خورشید نعمانی ردولوی کی وفات کے بعد جب انھوں نے ان پر مضمون لکھا تو اس میں وہ تمام باتیں تحریر کیں جن کا تعلق موصوف کی زندگی سے تھا۔الیاس صاحب نے پروفیسر موصوف کے علمی و ادبی کارناموں کے علاوہ ان کی ذاتی باتوں کو بھی مضمون میں شامل کیا۔جب وہ ممبئی سے ریٹائر ہو کر ردولی آئے تو اپنے ساتھ کتابوں کا قیمتی خزانہ لائے تھے، جسے دیمکوں نے کھا لیا تھا۔اس واقعے کو یاد کر کے پروفیسر موصوف الیاس صاحب کے سامنے کئی بار اشک بار ہوئے۔

پروفیسر اصغر عباس کی یاد میں لکھا گیا مضمون بہت دل چسپ و معلوماتی ہے۔اصغر صاحب کئی بار الیاس صاحب سے اس بات کا تذکرہ کر چکے تھے کہ اعظم گڑھ والے مجھے اپنا نہیں سمجھتے، لیکن جواباً الیاس صاحب کہتے کہ آپ بھی تو اعظم گڑھ والوں کو اپنا نہیں سمجھتے۔اصغر صاحب کی منکسر المزاجی پورے علی گڑھ میں مشہور تھی۔موصوف سے الیاس صاحب کے خوش گوار تعلقات تھے۔اصغر صاحب ماہرِ سرسید تھے، اس لیے وہ اپنی تقریروں و خطبوں میں سرسیّد کا ذکر ضرور کرتے۔اصغر صاحب نے تا عمر سرسیّد کے نظریات و افکار کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔سرسیّد کے تعلق سے ان کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ان کا تحقیقی مقالہ 'سرسید کی صحافت' سرسید کی صحافتی خدمات کو سمجھنے اور جاننے کا بہترین ذریعہ ہے۔

مولانا جلال الدین عمری، الیاس صاحب سے گہری انسیت رکھتے تھے۔مولانا کا شمار ہندستان میں کثیر التصانیف مولفین و مصنّفین میں ہوتا ہے۔ان کی 90 سے زیادہ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔انھوں نے اپنی کتابوں میں دعوتی، اصلاحی و تبلیغی پہلو کو مقدم رکھا ہے۔ وہ جماعتِ اسلامی (ہند) کے امیر بننے سے پہلے جامعۃ الفلاح، سہ ماہی رسالہ 'تحقیقاتِ اسلامی' اور ادارۂ تحقیق و تصنیف علی گڑھ سے وابستہ رہ چکے تھے۔مولانا کی پُر وقار شخصیت اور آدابِ زندگی سے سب متاثر ہوتے تھے۔انھوں نے اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ افراد کے سامنے پیش کیا۔الیاس صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا کہ اصلاً ان کا تعلق ریاست تامل ناڈو سے تھا لیکن وہ رام پور میں جماعت اسلامی کے ادارۂ تحقیق و تصنیف سے وابستہ ہوئے۔الیاس صاحب، رسالہ 'تحقیقاتِ اسلامی' میں جو مضامین ارسال کرتے مولانا جلال الدین عمری ان کی رسید موصوف کو دیتے۔اس مضمون میں الیاس صاحب نے وہ مکتوبات بھی شامل کیے جو مولانا نے انھیں لکھے تھے۔

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی پر لکھی تعزیتی تحریر میں الیاس صاحب نے بتایا کہ برقی صاحب شریف اور وضع دار انسان تھے۔وہ کبھی کسی کا بُرا نہیں مانتے تھے۔سب لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے میں ان کا یقین تھا، لیکن بعض لوگ ان کی شاعری پر ان کے سامنے ہی سخت چوٹ کرتے تھے۔جب کہ یہ لوگ ناقد نہیں تھے، نکتہ چینی کرنا ان کا معمول تھا۔برقی صاحب نے ان باتوں کو کبھی دل سے نہیں لگایا بلکہ ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے اَن سُنا کر دیتے۔برقی اعظمی نے اپنے کئی شاعر دوستوں کی غزلوں اور نظموں کو فارسی کے قالب میں ڈھالا تھا۔اس مضمون میں الیاس صاحب نے برقی اعظمی کی کئی غزلیں شامل کی ہیں۔الیاس صاحب کی کتاب ''بیانِ شبلی'' کی اشاعت کے بعد برقی اعظمی نے اس پر درج ذیل شعر کہا:

آپ کے پیشِ نظر ہے جو 'بیانِ شبلی'
سب پہ ہے اس سے عیاں عظمت و شانِ شبلی
ہے یہ الیاس کی سب کے لیے سوغاتِ عظیم
جس سے ہے وردِ زباں نام و نشانِ شبلی

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی وفات نے الیاس صاحب کو کئی دن تک پریشان کیا۔ان کی نظر میں نسیم صاحب جس عہدے اور رتبے کے مستحق تھے وہ انھیں نہیں ملا۔پی ایچ. ڈی اور نیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے جون پور کے ایڈیڈ اسکول میں ملازمت کی۔نسیم صاحب نے تعلیمی نظام اور پالیسیوں پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔الیاس صاحب نے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ میری نسیم صاحب سے اتنی یادیں وابستہ ہیں کہ اگر انھیں لکھا جائے تو ایک کتاب بن جائے۔دونوں حضرات نے ہندستان کے متعدد شہروں میں ایک ساتھ کتابوں کی رسمِ اجرا کے پروگراموں میں شرکت کی، مقالے پڑھے اور ادبی مجلسوں میں بھی شریک رہے۔نسیم صاحب نے اعظم گڑھ اور مئو کے کئی ادبا و شعرا کی کتابوں کی نوک پلک تک درست کیں۔ وہ خود متعدد کتابوں کے مصنف و مرتب تھے۔تحقیق و تنقید ان کا خاص میدان تھا۔انھوں نے اپنی جیبِ خاص سے کئی اُردو رسائل نکالے جن میں 'ادب نکھار'، 'عالمی ادبی گزٹ' اور 'تحقیق و تخلیق' قابلِ ذکر ہیں۔

ضیا فاروقی سے الیاس صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے۔اکثر موبائل پر الیاس صاحب فاروقی صاحب سے ان کی خیریت معلوم کرتے تھے۔لیکن الیاس صاحب کی ضیا فاروقی سے 12 نومبر 2024 کو ہوئی ٹیلی فونک گفتگو آخری گفتگو ثابت ہوئی۔ضیا فاروقی 13 نومبر 2024 کو اس دارِفانی سے رخصت ہوئے۔الیاس صاحب لکھتے ہیں کہ ضیا فاروقی قصبہ سندیلہ میں پیدا ہوئے لیکن ملازمت کے سلسلے میں وہ کان پور چلے آئے۔یہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت کی وجہ سے ان کے اندر شعری ذوق پروان چڑھا۔انھوں نے کان پور شہر کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے 2005 میں طویل مثنوی 'کان پور نامہ' تخلیق کی۔اس مثنوی کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد ضیا فاروقی بھوپال منتقل ہو گئے تھے۔یہیں وہ پیوندِ خاک ہوئے۔

بہرنوع! ڈاکٹر الیاس نے زیرِ نظر کتاب کی تعزیتی تحریروں میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔انھوں نے تمام مضامین میں مرحومین سے اپنے دیرینہ تعلقات کے علاوہ ان کی ملی، ادبی اور علمی خدمات کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔کتاب کے مطالعے کے دوران بعض مقام ایسے بھی آتے ہیں جہاں آنکھوں سے آنسو خود بخود نکل پڑتے ہیں۔موصوف نے جس سلیس و رواں دواں انداز میں مضامین قلم بند کیے ہیں، انھیں ایک نشست میں پڑھنا لازمی ہے۔تمام مضامین وفیاتی تحریروں کا اعلا نمونہ ہیں۔ہم امید کرتے ہیں کہ وفیاتی ادب میں الیاس صاحب کی اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوگی۔ ◆◆

اُردو زبان و ادب کا پہلا محقق و مدرس
جان بارتھ وِک گل کرسٹ
تالیف و ترجمہ: صدیق الرحمٰن قدوائی
قیمت: 250 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

اُردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر
رؤف پاریکھ
قیمت: 300 روپے

عباس تابش: شعری سرقے کا تسلسل، کون کون شریکِ جرم

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

اب یہ موسم مری پہچان طلب کرتے ہیں
میں جب آیا تھا یہاں تازہ ہوا لایا تھا
میرے ہاتھوں میں بھی زیتون کی شاخیں تھیں کبھی
میں بھی ہونٹوں پہ کبھی حرف دعا لایا تھا

(سلیم کوثر)

تم ہی آئے نہ صلح کی جانب
جب کہ میں بیچ میں خدا لایا
سخت ویران تھا یہ باغ سخن
میں یہاں موسمِ دعا لایا

(عباس تابش)

میں یہاں تک تو چلا آیا ہوں گردش کرتا
اور کیا مجھ سے تری کوزہ گری چاہتی ہے

(رضی اختر شوق)

تجھے تو علم ہے کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تو نے یوں نہیں چاہا، تو کیا، جو تو چاہے
ذرا شکوۂ دو عالم کے گنبدوں میں لرز
پھر اُس کے بعد ترا فیصلہ جو تو چاہے

(مجید امجد)

یہاں تلک تو میں آیا ہوں دل کے کہنے پر
اب اس سے آگے ترا فیصلہ جو تو چاہے

(عباس تابش)

ایسا لگتا ہے کہ یہ بات کئی بار ہوئی
آخری بار ملاقات کئی بار ہوئی

(شہزاد سلیم)

کھینچ لیتی ہے ہمیں تیری محبت ورنہ
آخری بار کئی بار ملے ہیں تم سے

(عباس تابش)

وہ میرے ضبط کا اندازہ کرنے آیا تھا
میں ہنس کے زخم نہ کھاتا تو اور کیا کرتا؟

(محسن نقوی)

لہو کے گھونٹ نہ پیتا تو اور کیا کرتا
وہ کہہ رہے تھے ترا انتظام کرتے ہیں

(عباس تابش)

ہوا اڑا کے مجھے جس طرف بھی لے جائے
ترے خیال میں بچھڑا ہوا پرندہ ہوں

(فرحت عباس شاہ)

تلاش رزق میں نکلے ہوئے پرندوں کو
میں جیب خرچ سے دانہ کھلایا کرتا تھا

(عباس تابش)

مرے گھر سے ابھی تہذیب کا رشتہ نہیں ٹوٹا
مرے بچے، بزرگوں کو ابھی آداب کہتے ہیں

(شاعر نامعلوم)

ابھی تو گھر میں نہ بیٹھیں کہو بزرگوں سے
ابھی تو شہر کے بچے سلام کرتے ہیں

(عباس تابش)

تو اسے اپنی تمناؤں کا مرکز نہ بنا
چاند ہرجائی ہے ہر گھر میں اتر جاتا ہے

(اقبال ارشد)

تیرا سورج کے قبیلے سے تعلق تو نہیں
یہ کہاں سے تجھے آیا ہے سبھی کا ہونا ؟

(عباس تابش)

چھوڑنے میں نہیں جاتا اسے دروازے تک
لوٹ آتا ہوں کہ اب کون اسے جاتا دیکھے

(شہزاد احمد)

یہ ہم جو تجھے جاتا ہوا دیکھ رہے ہیں
ایسے تو چلی جائے گی بینائی ہماری

(عباس تابش)

چاروں طرف میں اس کے قدم ڈھونڈتی رہی
اس گھر میں کوئی پانچواں کونہ تو ہے نہیں

(شاعر نامعلوم)

اے ہجر تو ہی کر لے کوئی شکل اختیار
بچھڑے ہوؤں نے لوٹ کے آنا تو ہے نہیں

(عباس تابش)

میرے جیسا کوئی بنیاد میں کام آتا ہے
گھر کی تختی پہ کسی اور کا نام آتا ہے

(سید صہیب ہاشمی)

مسئلہ کوئی بھی ہو نام ترا لیتا ہوں
کیا کروں میں کہ مجھے ایک ہی نام آتا ہے

(عباس تابش)

تابش کا جرم صرف یہی نہیں کہ اس نے چوریاں کیں بلکہ اس سے بھی بڑا جرم ہے کہ اس نے جاہل لوگ اکٹھے کیے اور خود کو استاد شاعر بنا کر پیش کرنے کے بعد چوری کو رواج دیا۔ میری نظر میں سرقہ اب کوئی انفرادی فعل نہیں رہ گیا بلکہ اسے جس طرح شاگردوں اور گاہکوں میں تقسیم کیا گیا اس کے باعث یہ ایک خوفناک ادبی وسماجی ناسور کی شکل اختیار کر چکا ہے جس کے چند نقصانات درج ذیل ہیں:

1- پرانے لکھنے والوں کی حق تلفی اور نوجوان شاعروں کی حوصلہ شکنی۔۔

جب اصل تخلیق نظر انداز ہو اور چربہ ساز مقبول ہو جائے تو تخلیق دم توڑ دیتی ہے۔

2- ادبی معیار کی گراوٹ۔۔۔

سرقہ زدہ شاعری وقتی داد تو سمیٹ لیتی ہے، مگر ادب کو بانجھ بنا دیتی ہے۔

3- تہذیبی حافظے کی تباہی

ادب قوموں کی یادداشت ہوتا ہے۔ جب یہ یادداشت چوری شدہ مواد سے بھر جائے تو تہذیب کھوکھلی ہو جاتی ہے۔

4- اخلاقی انتشار

اگر ادب میں بددیانتی قابل قبول ہو جائے تو پھر کسی بھی شعبے میں دیانت کی توقع فضول ہے۔

عباس تابش کا معاملہ کسی ایک شاعر کا نہیں، یہ ادبی نظام کی ناکامی کی کیس اسٹڈی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ اس نے کتنے شعر چرائے، سوال یہ ہے کہ ہم نے اسے کب تک برداشت کیا۔

ادب میں اصل تخلیق کی بقا اسی وقت ممکن ہے جب سرقے کو اس کے اصل نام سے پکارا جائے:

* یہ بدذوقی نہیں، جرم ہے۔
* یہ روایت نہیں، خیانت ہے۔

اور میری طرف سے یہ اختلاف نہیں، احتساب ہے کیوں کہ ادب میں سرقے کا سب سے خطرناک پہلو یہ نہیں کہ کوئی شاعر چوری کرتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ چوری کو ہنر، روایت اور قابلِ فخر چالاکی بنا دے۔ جب سرقہ ایک وقتی لغزش کے بجائے مستقل روش اختیار کر لے تو پھر اس کا تجزیہ اخلاقی خطبے سے بھی نہیں بلکہ علمی درجہ بندی سے کیا جاتا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ معاملہ کہاں کہاں اور کس کس سطح پر بگڑا ہے۔

عباس تابش کے معاملے میں سرقہ کسی ایک شکل تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایک کثیر جہتی واردات ہے جو کم از کم چار واضح اقسام میں تقسیم کی جا سکتی ہے:

1- چربہ (Direct Borrowing wit Minor Alteration)

یہ سرقے کی سب سے عام مگر سب سے بنیادی شکل ہے۔ اس میں اصل شاعر کے خیال، مضمون اور فکری ساخت کو برقرار رکھتے ہوئے صرف۔۔۔

* لفظی ترتیب بدلی جاتی ہے
* لہجے میں ہلکی سی نرمی یا سختی لائی جاتی ہے
* مصرعوں کی سمت پلٹ دی جاتی ہے

عباس تابش کی شاعری میں اس قسم کا سرقہ کثرت سے موجود ہے۔ مثال کے طور پر بھگت کبیر کا کلام دیکھیے:

تال سوکھ کر پتھر بھیو ہنس کہیں نہ جائے۔
پچھلی پیت کے کارنے کنکر چن چن کھائے

(بھگت کبیر)

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

(عباس تابش)

یہاں نہ خیال نیا ہے، نہ مضمون، نہ فکری زاویہ۔ صرف لفظی ہیر پھیر ہے۔ یہ چربہ اس لیے خطرناک ہے کہ زیادہ تر عام قاری بھگت کے شعر سے واقف ہی نہیں، اس لیے اسے پکڑ نہیں پاتے، مگر باشعور اور باضمیر قاری کے لیے فوراً اسے شناخت کرنا مشکل نہیں۔

2- ترجمہ بطور سرقہ (Translation as Theft)

یہ سرقے کی وہ شکل ہے جسے علمی دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ گرفت سمجھا جاتا ہے۔

اس میں کوئی مصنف یا شاعر۔۔۔

* کسی غیر اردو شاعر کا شعر یا نثر پارہ لیتا ہے
* لفظ بہ لفظ یا خیال بہ خیال اردو میں منتقل کرتا ہے
* اور اسے اپنی ذاتی تخلیق کے طور پر پیش کرتا ہے

عباس تابش نے اس طریقے کو نہایت ڈھٹائی سے استعمال کیا۔ مثال کے طور پر جیسے شروع میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

شہیدی قمی کا فارسی شعر:

شبی گفتم مرا از تیرگی ہا ہول می آید
از آں شب دیدۂ مادر شدہ از خواب محرومی

عباس تابش:

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

یہ تخلیق نہیں، سیدھا ترجمہ ہے۔ نہ تجربہ ذاتی ہے، نہ تخلیقی اضافہ۔ یہ سرقہ اس لیے زیادہ سنگین ہے کیوں کہ یہاں شاعر نے زبان بدل کر مصنف ہی بدل دیا۔

(باقی آئندہ)

پہلی قسط

عباس تابش: شعری سرقے کا تسلسل

کون کون شریکِ جرم

فرحت عباس شاہ

ہم اپنی ایک تحریر میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ عباس تابش کے شعری سفر کا بنیادی مسئلہ فنی چوکس بازی نہیں بلکہ اخلاقی انحراف ہے۔ یہ انحراف محض ایک آدھ شعر کی چوری تک محدود نہیں بلکہ ایک طے شدہ منظّم رویّہ ہے جو پیسے اور دیگر 'مفادات' کی تین دہائیوں پر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سرِدست سوال یہ نہیں کہ فلاں شعر کس سے مشابہ ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ یہ مماثلتیں کیوں بار بار ایک ہی سمت میں جاتی ہیں؟ یہ وہ مقام ہے جہاں سرقہ ایک انفرادی لغزش نہیں رہتا بلکہ مجرمانہ واردات بن جاتا ہے۔

ادب میں سرقہ محض الفاظ کی چوری نہیں ہوتا، یہ تجربے کی چوری، احساس کی چوری اور تاریخی تسلسل کی چوری ہوتا ہے۔ ایک شاعر جب کسی دوسرے شاعر کے خیال، مضمون یا اسلوب کو معمولی الٹ پھیر کے ساتھ اپنے نام سے پیش کرتا ہے تو وہ دراصل تین سطحوں پر جرم کرتا ہے:

1- اصل خالق کے ساتھ ناانصافی
2- قاری اور سامع کو دھوکا
3- ادبی روایت کو مسخ کرنا

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی بھی سنجیدہ ادبی روایت میں سرقہ کو معمولی بددیانتی نہیں بلکہ علمی خیانت سمجھا جاتا ہے۔

شواہد کی روشنی میں سرقے کا طریقِ واردات ذیل میں دی گئی مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی پیٹرن بار بار نمایاں ہو رہا ہے:

* اصل شعر کا مرکزی خیال محفوظ رکھا گیا ہے
* لفظیات میں معمولی تبدیلی
* زاویۂ بیان کو الٹا یا نرم کر کے اپنا نام ثبت

یہ طریقِ واردات اتفاق نہیں، بلکہ مشاق چور کی پہچان ہے۔

مثال1: عشق بطور مستقل مشقت ۔اصل شعر (رئیس فروغ):

عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ ہم اپنے لیے
ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے

عباس تابش:

مصروف ہیں کچھ اتنے کہ ہم کارِ محبت
آغاز تو کر لیتے ہیں جاری نہیں رکھتے

یہاں عشق کو 'کار' اور 'مسلسل مشقت' کے استعارے میں باندھنے کا بنیادی تصور رئیس فروغ کا ہے۔ تابش نے صرف نتیجے کی صورت بدل دی، مگر خیال، مضمون اور فکری بنیاد وہی رہی۔

مثال2: ماں کی بے خوابی — ترجمہ بطور سرقہ ۔اصل (شہیدی قمی):

شبی گفتم مرا از تیرگی ہا ہول می آید
از آں شب دیدۂ مادر شدہ از خواب محرومی

عباس تابش:

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

یہاں خیال کی چوری سے بھی اگلی واردات ہے یعنی سیدھا سیدھا ترجمہ ہی کر ڈالا گیا ہے۔ نہ تجربہ ذاتی ہے، نہ اسلوب۔ یہ سرقے کی وہ شکل ہے جو علمی دنیا میں سب سے سنگین سمجھی جاتی ہے۔

مثال3: پرندوں کی حکومت — خواہش سے درخواست تک

محمد اظہار الحق:

ملے اک بار بچوں یا پرندوں کو حکومت
کوئی ایسا طریقہ، شہر ہوں خوشحال سارے

عباس تابش:

یار اک بار پرندوں کو حکومت دے دو
یہ کسی شہر کو مقتل نہیں ہونے دیں گے

خیال، استعارہ اور اخلاقی تمثیل ایک جیسی ہے۔ صرف لہجہ بدلا گیا ہے۔ یہ خیال کا سرقہ ہے، جو محض لفظی نہیں بلکہ فکری چوری بھی ہے۔

مثال4: قرب اور درد، فراز سے ہوتا ہوا تابش تک کیسے پہنچا۔۔۔

احمد فراز:

قرب اچھا ہے مگر اتنی بھی شدت سے نہ مل
یہ نہ ہو تجھ کو مرے روگ پرانے لگ جائیں

عباس تابش:

تو محبت کی غرض لمحۂ موجود سے رکھ
تیرے ذمے نہ مرے درد پرانے لگ جائیں

یہاں مصرعے بدل گئے، مگر معنوی ڈھانچہ جوں کا توں ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سرقہ انتہائی عیاری مگر دیدہ دلیری سے کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص فیض کا مشہور عالم کلام گیت بنا کے بیچ سکتا ہے، اس کے لیے شرم جیسی کسی شے کا نا معلوم ہونا کسی اچنبھے کی بات نہیں۔ ذیل میں کچھ مزید وارداتیں ملاحظہ فرمائیے:

ہوا چلی تو پھر آنکھوں میں آ گئے سب رنگ
مگر وہ سات برس لوٹ کر نہیں آئے
(محبوب خزاں)

پلٹ کے آ گیا تو بھی تری محبت بھی
مگر وہ پندرہ برس لوٹ کر نہیں آئے
(عباس تابش)

محل کے سامنے اک شور ہے قیامت کا
فقیہ شہر کو اونچا سنائی دیتا ہے
(مشیر کاظمی)

دہائی دیتا رہے جو دہائی دیتا ہے
کہ بادشاہ کو اونچا سنائی دیتا ہے
(عباس تابش)

رابطہ رکھتے نہیں خاک نشینوں سے کوئی
اب پیمبر نہیں قوموں پہ خدا آتے ہیں
(شہزاد احمد)

دورِ آخر ہے سو تبلیغِ محبت کے لیے
اب پیمبر نہیں اہلِ قلم آتے ہیں
(عباس تابش)

ہوں غزل کی چنائی میں مصروف
لفظ اینٹیں ہیں اور میں مزدور
(حلیم قریشی)

بتا اے در بدری لفظ ہیں کہ اینٹیں ہیں
مکاں بنا لیا میں نے غزل بناتے ہوئے
(عباس تابش)

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا
(محمد قاصر)

یہ لوگ نوکری پیشہ ہیں اور چاہتے ہیں
سوائے عشق انھیں اور کوئی کام نہ ہو
(عباس تابش)

رات بھر پچھلی سی آہٹ کان میں آتی رہی
جھانک کر دیکھا گلی میں کوئی بھی آیا نہ تھا
(عدیم ہاشمی)

میں اس کی آہٹیں چُن لوں میں اس سے بول کر دیکھوں
گلی میں کون پھرتا ہے دریچہ کھول کر دیکھوں
(عباس تابش)

وقت مقتل سے مری لاش اٹھا لایا تھا
لوگو میں اپنی گواہی میں خدا لایا تھا

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے **(ادارہ)**

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***